اکیسویں صدی کا منظر

حسین مطلب
ترجمہ و تلخیص: محمد ایوب منیر

احیا، مفہوم و اثرات

اسلامی احیا کے عالمی اثرات ہر طرف محسوس کئے جارہے ہیں۔ غیر مسلم، خصوصاً اہل مغرب اسے شک و شبہ کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ہارورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر ہنٹنگٹن نے آیندہ صدی کے حوالے سے ''تہذیبی تصادم'' کا نظریہ پیش کیا ہے۔ دوسری طرف اسلام اور اسلامی احیا کے تصور کو مسخ کرنے میں انتہا پسندوں کا اپنا کردار ہے چاہے وہ مسلمان ہوں یا غیر مسلم۔

مسلمان معاشروں میں مغرب کو یکسر مسترد کرنے اور مغرب کے سانچے میں مکمل ڈھل جانے کے متضاد رویے موجود ہیں جب کہ اسلامی تحریکات کے نتیجے میں اسلامی اقدار اور روایات عالمی توجہ کا مرکز بنے ہیں۔ اسلامی احیا کے بارے میں مسلمان اہل دانش اور اشرافیہ نے ملے جلے ردعمل کا اظہار کیا ہے۔ چند ممالک میں اسلامی تحریکوں کے سیاسی و اقتصادی کردار کی وجہ سے کچھ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اسلام کی برتری کو تسلیم کیا جارہا ہے اور یہ مذہب نہ صرف اپنے ممالک میں بلکہ عالمی پیمانے پر بھی اہم کردار ادا کرنے کی صلاحیت کا حامل ہے۔ کچھ دوسرے لوگوں کے خیال میں ان تحریکات کے اثر سے مسلمانوں کی حالت اور اسلامی ممالک کے اپنے کردار میں تو بہتری نظر نہیں آرہی، عالمی کردار کیسے ادا ہوسکے گا۔

اسلامی نشاتِ ثانیہ کے حوالے سے اس عمومی صورت حال میں تبدیلی یا غیر معمولی بہتری اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک مسلم قائدین تحریک اور اہل دانش روزمرہ چیلنجوں کا مقابلہ کرنے کے لئے ایمان اور تدبر کے ساتھ نئے خیالات نئی حکمت عملی اور نیا لائحہ عمل اختیار نہ کریں۔ اگر انھوں نے اس سے غفلت برتی تو طاقتور ممالک مثلاً امریکہ، یورپی برادری، روس، چین اور جاپان، نیز نئے صنعتی ممالک ان کا کردار محدود کر دیں گے۔

دو پیش منظر

حالیہ برسوں کی عالمی ترقی کے نتیجہ میں دو پیش منظر سامنے آسکتے ہیں۔ اس میں ہمارے مقام کا تعین نہ صرف ہمارے کردار سے ہو گا بلکہ عالمی برادری خصوصاً غیر مسلم مغربی طاقتیں بھی اس میں اپنا کردار ادا کریں گی۔ نو آبادیاتی دور میں ہم ان کو اچھی طرح آزما چکے ہیں۔ یہ استعماری طاقتیں اسلامی ممالک پر مسلط ہوئیں تو مسلمانوں کا اقتصادی 'سیاسی اور مذہبی وجود مسخ ہو گیا اور ہم آج تک اس کا خمیازہ بھگت رہے ہیں۔ اب تو غیر مسلم قوتوں کے پاس ایسے ذرائع موجود ہیں جن سے بظاہر آزاد مسلم ممالک کو عملاً کالونیوں میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ اکیسویں صدی میں تو دنیا اور بھی سمٹ جائے گی اور عالمی گاؤں حقیقتاً وجود میں آجائے گا۔ اس وقت جن کے ہاتھ میں باگ ڈور ہو گی وہی انسانی زندگی کے معاملات اور اقدار پر بھی اثر انداز ہوں گے۔

پہلا منظر

ایک منظر تو یہ سامنے آتا ہے کہ دنیا نسبتاً محفوظ 'پر سکون اور مستحکم ہو جائے۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب فوجی یا سیاسی گٹھ جوڑ کے بجائے معیشت و تجارت ریاستوں کے درمیان تعلقات کی بنیاد ہو۔ سرد جنگ کے خاتمے سے عالمی امن کو لاحق خطرات میں کمی واقع ہوئی ہو۔ ریاستیں جانتی ہوں کہ ان کی اصل ترجیح اقتصادی خوشحالی ہے اور انھوں نے اپنی تمام ذرائع وسائل اقتصادی خوشحالی کے لیے لگا دیے ہوں۔ امریکہ ' چین ' جاپان اور روس جیسی بڑی طاقتیں نیز ایشیا بحرالکاہل کی قوتیں اپنے رویوں میں اس قدر لچک دار ہو چکی ہوں کہ وہ کم ترقی یافتہ ممالک کو اٹھانے اور ساتھ ملانے کے لیے ایمان داری اور انصاف سے سرگرم کردار ادا کر رہی ہوں۔

وہ عالمی مسائل جو ملکی سرحدوں سے ماوراہیں مثلاً ماحولیات 'کثرت آبادی 'ایڈز' غربت ' عدم فراہمی خوراک ' وبائی بیماریاں ' عالمی دولت کی منصفانہ تقسیم جیسے امور' زیادہ منظم انداز میں حل ہو رہے ہوں تاکہ دنیا بھر کے شہریوں کو مجموعی طور پر اس کا فائدہ پہنچ سکے۔ آزاد جمہوری اقدار کے ہر ملک میں رواج سے ملکوں کے درمیان ہم آہنگی پیدا ہوگئی ہو۔ اقوام متحدہ زیادہ ذمہ دار اور زیادہ موثر بن چکی ہو اور اقوام عالم کی برادری ناانصافیوں کے خاتمے ' اجتماعی نشوونما اور مزید پر امن دنیا کے حصول کے لیے اقوام متحدہ پر اعتماد رکھتی ہو۔ یہ ایک ممکنہ پیش منظر ہو سکتا ہے۔

دوسرا منظر

دوسرا ممکنہ عالمی منظر پریشان کن ہو سکتا ہے۔ سرد جنگ کے خاتمے کے بعد دنیا کے مختلف ممالک میں عدم استحکام اور مذہبی اور لسانی خلفشار پیدا ہو گیا ہو۔ فاشسٹ اور کمیونسٹ حکومتوں کے ٹوٹنے پر

ماضی کی دشمنیاں جس طرح بوسنیا اور روانڈا میں پھوٹ پڑی تھیں اب دوسری جگہوں تک پھیل گئی ہوں۔ عالمی پیمانے پر دو بڑی قوتوں کے خاتمے کے بعد چین، جاپان اور جرمنی جیسی علاقائی اقتصادی قوتیں زیادہ موثر کردار کی متمنی ہوں۔

کرشماتی لیڈروں کی وفات سے کچھ ممالک میں عدم استحکام اور تخریب شروع ہو چکی ہو۔ چین میں ڈینگ ژیاؤپنگ کے مرنے سے یہ منظر پیدا ہو سکتا ہے۔ اس کی بدترین شکل یہ بھی ممکن ہے کہ سارے چین میں جنگجو سردار سر اٹھائیں اور تیرہ فی صد سالانہ کی رفتار سے بڑھنے والی اس کی اقتصادی ترقی دھری کی دھری رہ جائے۔ اس قسم کے مدوجزر دنیا بھر میں اثرات مرتب کریں گے۔ روس اپنے کسی نئے قوم پرست لیڈر کی سرکردگی میں اپنے ہمسایہ ممالک میں چیچنیا کی طرح مہم جوئی پر اتر آئے۔ مشرق وسطیٰ میں قیام امن کا عمل اسرائیل عرب تعلقات کو پرامن کر دے لیکن یہ علاقے کے سیاسی و اقتصادی نظام کے لیے خطرے کا باعث بھی بن سکتا ہے۔ جزیرہ نما کوریا، جنوبی بحرچین، بالٹک کی ریاستیں اور دیگر علاقے سیاسی کشمکش کا مرکز بن سکتے ہیں۔ مغربی جمہوریت میں یقین نہ رکھنے والے ممالک مثلاً اسلامی ریاستیں اور کنفیوشس مذہب کی پیروکار ریاستیں اپنی تہذیبی و ثقافتی آزادی کا مظاہرہ کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے حلقہ اثر میں اضافہ کرنے کے لیے نئے جھگڑے کھڑے کر لیں۔ اس صورت حال میں اقوام متحدہ کے اثرات میں کمی ہو گی اور وہ عالمی پیمانے پر امن قائم کرنے میں کوئی کردار ادا نہ کر سکے گی۔ دنیا میں انتشار اور عدم استحکام کا چلن ہو گا۔

بہت سے سیاسی رہنما مستقبل کے ان متوقع مناظر میں سے پہلے منظر کو حقیقت بنانے کے حق میں زیادہ ہیں تاکہ دنیا رہنے کے لیے پرسکون جگہ ہو۔ مسلمانوں کو پہلے منظر کی امید کے ساتھ ساتھ دوسرے بلکہ بدتر منظر کے لیے بھی تیار رہنا چاہیے۔

اسلامی نشاتِ ثانیہ: پرانے نصب العین، نئے قالب

بیسویں صدی میں نشاتِ ثانیہ کے قائدین، حسن البنا"، محمد اقبال"، ابوالاعلیٰ مودودی"، محمد ناصر"، حسن الترابی، علی شریعتی" اور آیت اللہ خمینی" یا اخوان المسلمین، جماعت اسلامی اور محمدیہ جیسی تحریکوں نے اسلامی بیداری اور احیا کا پیغام پہنچایا۔ ان کا پیغام یہ تھا کہ اسلامی تعلیمات پر عمل کریں، اور شاندار اسلامی ماضی کو سامنے رکھ کر مستقبل کی تعمیر کریں۔ عقائد خامیوں سے پاک ہو جائیں اور اسلامی ریاست یا اس سے ملتا جلتا نظام وجود میں آ جائے۔ اسلام کے بنیادی اصولوں کی طرف بار بار متوجہ کرنے کی وجہ سے، ان کی پکار کو منفی رخ دینے کے لیے بہت سے مغربی مفکرین اور سیاست دانوں نے انھیں "بنیاد پرست" کا الزامی تعارف دیا حالانکہ مذکورہ بالا مفکرین نے کوئی نئی چیز پیش نہیں کی تھی، اسلام کی اصل تعلیمات کی طرف لوگوں کو متوجہ کیا تھا۔ ان سے پہلے محمد بن عبدالوہاب"

(۹۲-۱۷۰۳)' شاہ ولی اللہ دہلوی" (۹۳-۱۷۰۲)' مہدی محمد احمد" (۸۵-۱۸۴۸)' محمد علی سنوسی" (۱۸۵۹-۱۷۸۷) اور ان کے پیروکاروں نے بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مشن کی طرف ہی بلایا تھا۔

اکیسویں صدی میں درپیش چیلنج

مستقبل کی کچھ چیزیں روز روشن کی طرح واضح ہیں۔ ٹیکنالوجی اور ابلاغ کے میدان میں ترقی' باہم قریب ہوتی دنیا' جدید ترین ایجادات' عالمی اقتصاد و سیاست میں کئی شاطروں کا کردار' غلبہ حاصل کرنے کے لیے نظریاتی ثقافتی لسانی مذہبی کشمکش اور مسلمانوں کی فکری قیادت کے مشرق وسطیٰ سے جنوب مشرقی ایشیا اور امریکہ منتقل ہونے سے عربی کے بجائے انگریزی کے رابطہ زبان بننے کے امکانات۔

مذکورہ بالا تمام رجحانات' دراصل مسلمانوں کو آیندہ درپیش چیلنج ہیں:

۱۔ اقتصادی چیلنج: مسلمان اپنا علم اور مہارت کس طرح بڑھائیں تاکہ دور جدید کے مسائل کا حل اسلامی تعلیمات کی رہنمائی میں تلاش کریں۔

۲۔ معاشرتی و تہذیبی چیلنج: مغربی تہذیب اور اس کے مظاہر مثلاً سیکولرزم' نیشنل ازم اور لبرلزم سے کس طرح معاملہ کیا جائے۔

۳۔ سیاسی چیلنج: مقامی اسلامی قیادت بین الاقوامی سطح پر کس طرح اپنی قوت اور وزن تسلیم کرا سکتی ہے۔

اقتصادی چیلنج

اس کا تعلق طلب علم اور فنی مہارت کو جدید بنانے سے ہے۔ انسانی تہذیب کی تاریخ یہ ہے کہ زیادہ علم اور زیادہ مہارت والے لوگ زیادہ خوش حال اور غالب رہتے ہیں۔ زمانہ قبل اسلام کی عرب تہذیب سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے۔ یہ علاقہ اس قدر پس ماندہ تھا کہ اس دور کی بڑی طاقتوں بازنطین اور ایران نے اس کو نظرانداز کیے رکھا۔ جب عربوں نے اسلام کے زیر سایہ علم اور قوت حاصل کی تو دنیا ان پر رشک کرنے لگی۔

مسلمانوں کو یہی تعلیم دی گئی ہے کہ وہ علم حاصل کریں اور مہارت پیدا کریں تاکہ وہ وقت کی ضروریات پوری کر سکیں۔ ہمیں عالمی سطح کے سائنس دانوں' انجینئروں' ماہرین اقتصادیات و تجارت' علما اور بہ کثرت تجربہ کار فنی ماہرین کی ضرورت ہے۔ تعلیم یافتہ مسلمان ماہرین اور نوجوانوں کو یہ جاننا چاہیے کہ محض علم نہیں' علم کے ساتھ ایمان بھی مطلوب ہے۔ ورنہ ایسے ماہرین کی کھیپ پیدا ہوتی

چلی جائے گی جو اپنی خدمت کرنے کے تو قابل ہوں گے لیکن امت مسلمہ کی سربلندی کے لیے کوئی کردار ادا نہ کر سکیں گے۔ کئی ممالک کے تجربے سے یہ بات ثابت ہوئی ہے کہ اسلامی تعلیمات سے بے بہرہ نوجوان اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود اپنے معاشرے میں انتشار پیدا کرنے اور اپنے مذہب کو ضعف پہنچانے کا سبب بنتے ہیں۔

معاشرتی و تہذیبی چیلنج

اس چیلنج کے کئی پہلو ہیں لیکن ہم صرف دو پہلو زیر بحث لا رہے ہیں۔ مغرب زدگی اور اسلامی شناخت کے تحفظ کے حوالے سے اس کے اثرات۔ مغرب زدگی (westernization) اور جدید کاری (modernization) ہم معنی الفاظ نہیں ہیں۔ دوسرا عمل تو مثبت اور مطلوب ہے لیکن پہلا اس وقت تنقید کا نشانہ بنتا ہے جب ہر اس نظریہ اور چیز کو قبول کرنا شروع کر دیا جائے جو مغرب سے آئی ہو۔

قوم پرستی اور سرمایہ داری خصوصاً الحاد اور سیکولرزم ہماری ترقی کے راستے کی رکاوٹ ہیں۔ قوم پرستی کا منشا یہ ہے کہ اپنے تمام حقوق قومی ریاست کے مفاد پر قربان کر دیے جائیں۔ وہ مسلمان جو آج کل قومی ریاستوں میں رہایش پذیر ہیں اس خوفناک حقیقت سے خوب آگاہ ہیں۔ اپنے وطن سے محبت کرنا اسلامی نظریات کی نفی نہیں ہے۔ آنحضرتؐ نے خود فرمایا ہے کہ وطن سے محبت ایمان کا حصہ ہے لیکن اپنے وطن ہی کو سب کچھ سمجھ لینا اور حکمرانوں کی ہر طرح اطاعت ہی کو سب سے اہم ذمہ داری سمجھ لینا کئی مسائل پیدا کر سکتا ہے۔ ابن خلدون کے تصور 'عصبیہ (قومی خودداری و یک جہتی کا احساس) کو تسلیم کیا جا سکتا ہے لیکن تعصب کو گوارا نہیں کیا جا سکتا۔

سیکولرزم کے نظریے کے مطابق مذہب کا ریاست کے معاملات میں کوئی دخل نہیں ہے۔ اور انسانی مسرت کے لیے مالی خوش حالی سب سے اہم عنصر ہے۔ اس لحاظ سے یہ سرمایہ داری کے قریب ہے۔ سیکولرزم کا زور اس بات پر ہے کہ زیادہ سے زیادہ صلاحیت اور قابلیت حاصل کر لی جائے۔ اس میں مذہب کو بالکل دیس نکالا دے دیا جاتا ہے۔ یہ خیال کیا جاتا ہے کہ مذہب جدید دور اور ترقی کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ سیکولرزم اسلام کی ضد ہے کیوں کہ اس میں خدا کے وجود وحی اور آخرت کا انکار ہے۔ یہی معاملہ نظام سرمایہ داری کے ساتھ ہے۔ اس میں بھی مفاد کو خدا کا درجہ دے دیا جاتا ہے۔

آنے والے سالوں میں 'مذاہب کے احیا کے عالمی رجحان کے باوجود' قوم پرستی اور سیکولرزم زیادہ مضبوط ہو سکتے ہیں۔ مسلمانوں کو اس چیلنج کا مقابلہ اس طرح کرنا ہے کہ وہ مذہب بیزار قوم پرست معاشروں میں باقی رہ سکیں اور استحکام اور مضبوطی حاصل کر سکیں۔ غیر مسلم قوتوں نے عالمی

کنٹرول حاصل کر رکھا ہے۔ ذرائع ابلاغ کے ذریعے مغربی اقدار ہر معاشرے میں رائج ہو رہی ہیں۔ مسلمان اس عمل سے گزر رہے ہیں۔ آیندہ صدی میں یہ چیلنج شدید تر ہو جائے گا اور آنے والی نسلوں کے لیے اس کا تدارک زیادہ مشکل ہو جائے گا۔ قوم پرستی، سیکولرزم اور سرمایہ داری کے لیے بھی راستے کھلے ہوئے ہیں۔

مسلم اکثریت کے خصوصاً خوشحال ممالک بڑی تیزی کے ساتھ سیکولر اثرات جذب کر رہے ہیں۔ مسلم اقلیتوں کا کیا حال ہو گا اس کا اندازہ کرنا مشکل نہیں ہے، خاص طور پر ایسے ممالک میں جہاں سیکولرزم کو آئینی جواز اور حکومتی سرپرستی حاصل ہے۔ اس صورت میں انھیں اپنے اسلامی تشخص کو اس طرح بچانا ہوتا ہے کہ اکثریت کی طرف سے ان کو ملیامیٹ کرنے کا کام شروع نہ ہو سکے۔ فرانس میں مسلم طالبات کے ساتھ حجاب کے مسئلے پر جو کچھ پیش آیا وہ ایک الگ تھلگ واقعہ نہیں ہے کیونکہ دنیا کے کوئی ممالک میں مسلمان اپنی اسلامیت کی بدولت اس طرح کے امتیازی سلوک کا شکار ہیں۔ عمومی طور پر ایک غیر مسلم کا اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں جو تصور ہے وہ بھی مسلمانوں کے لیے ایک چیلنج ہے اور اس پر قرار واقعی توجہ کی جانی چاہیے۔ لیکن اس کے باوجود یہ بھی حقیقت ہے کہ مسلمان غیر مسلم سیکولر ممالک میں ان ممالک کی نسبت زیادہ اچھی زندگی گزار رہے ہیں جہاں کا سرکاری اور تسلیم شدہ مذہب اسلام ہے۔ ان برائے نام اسلامی ریاستوں میں مسلمان علما اور مسلمان سیاسی لیڈر عموماً قید و بند اور تعذیب کا نشانہ بنتے ہیں۔ قرآن کی آیات کی غلط تشریح کر کے مسلمان عورتوں کو ان کے حقوق سے محروم کیا جاتا ہے اور عام مسلمانوں کے لیے بھی دین کے مطابق زندگی گزارنے میں طرح طرح کی مشکلات پیدا کی جاتی ہیں۔

سیاسی چیلنج

سیاسی چیلنج کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ مسلم گروہوں کی قیادت، اسلامی ریاست کے لیے جدوجہد اور ایک عالمی اسلامی قیادت کی فراہمی۔ تنظیموں، جماعتوں، قوموں، مذاہب اور دیگر اجتماعی معاملات میں قیادت کامیابی یا ناکامی میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ اسلامی نقطہ نظر سے قیادت کے تصور میں، ایمان و تقویٰ کی شرط، صلاحیت و قابلیت سے پہلے پوری ہونا ضروری ہے۔ عجیب اتفاق ہے کہ مسلم معاشروں میں ان دونوں صلاحیتوں کی حامل شخصیات عنقا ہیں۔ اس قابل رحم صورت حال کی ایک وجہ تعلیم کا نظام بھی ہے جس میں سے گزر کر لوگ عملی زندگی میں داخل ہوتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں مسلمان معاشروں کی قیادت یا ان روایتی مذہبی علماکرام کے ہاتھ میں ہے جو قدیم دینی علوم پر کامل دسترس رکھتے ہیں لیکن جدید دور کے مسائل حل کرنا ان کے بس کی بات نہیں ہے، یا سیکولر لیڈروں کے ہاتھ میں ہے اور وہ بھی ان مسائل کو کماحقہ سمجھنے اور ان کا حل نکالنے کی صلاحیت سے محروم ہیں۔

نہ دین کی بنیادوں سے آگاہ ہیں نہ ان کا فہم رکھتے ہیں اور عملاً اس پر عمل پیرا ہیں اور نہ دین کا نفاذ ان کا مسئلہ ہے۔

دور جدید کے مسلمانوں کا ایک موجودہ اور مستقبل کا مسئلہ یہ ہے کہ قیادت میں جو دوئی پائی جاتی ہے اس کا حل تلاش کیا جائے۔اس کا حل تعلیم کا ایسا انتظام ہے جس میں قائدانہ صلاحیت کے حامل علما اور سیکولر تعلیم یافتہ مل جل کر نئی نسل کو قیادت کے لیے تیار کریں۔

دوسرا بڑا سیاسی مسئلہ اسلامی ریاست کا قیام ہے۔ علما کا اس بارے میں اختلاف ہے۔ آیا مسلمان جہاں کہیں بھی ہوں وہ اسلامی ریاست قائم کرنے کے پابند ہیں، یا نہیں ہیں۔تاہم اس پر اتفاق ہے کہ مسلمان ایک مثالی زندگی صرف اور صرف ایک حقیقی اسلامی ریاست ہی میں گزار سکتے ہیں، کہیں اور نہیں۔

اس سلسلے میں چند اور امور بھی سمجھ لینے ضروری ہیں۔اسلامی ریاست کو وجود میں لانے کے لیے موجودہ مسلم حکومتیں ایک طرز عمل اختیار کر سکتی ہیں۔تاہم جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں یا جہاں سیکولر نظام زندگی رائج ہے، وہاں کیا طرز عمل اختیار کیا جائے۔ دوم، اسلامی ریاست قائم کرنے کا کام ارتقائی اور بتدریج ہونے والا کام ہے کیونکہ ایک اسلامی ریاست کے قیام سے پہلے ریاست کی سماجی بنیاد اور تہذیبی ساخت اس کے لیے موزوں ہونا ضروری ہے۔ اگر مذکورہ شرائط کے بغیر اسلامی ریاست کے قیام کی کوشش کی گئی تو ملک میں انتشار پھیلے گا۔سوم، عوام اور قیادت کے درمیان اسلامی ریاست کی غرض و غایت اور افعال کے بارے میں کامل یکسوئی اور فکری یکجہتی پائی جانی چاہیے تاکہ بعد میں مختلف تعریفوں کی بنیاد پر مختلف دھڑے تشکیل نہ پائیں اور اسلامی ریاست کے نام پر ہی جھگڑے فساد جنم نہ لیں۔ چہارم، اگرچہ ہمارے پاس آنحضرتؐ اور آپؐ کے صحابہ کے دور میں ایک مکمل اسلامی ریاست کا کامیاب نقشہ موجود ہے تاہم یہ فراموش نہیں کیا جانا چاہیے کہ اس پر ۱۴سو برس گزر چکے ہیں اور ہمیں نئے حالات میں اسلامی ریاست کی راہ ہموار کرنی ہے۔

ہم سیاسی چیلنج کے دوسرے پہلو کی طرف آتے ہیں۔ہو سکتا ہے آنے والے دنوں میں اسلامی احیا کے ساتھ ساتھ یہ رجحان بھی جنم لے کہ کیوں نہ مسلم دنیا ایک نئی قیادت کے زیر اثر آجائے یعنی پان اسلام زم کا نعرہ عملی شکل اختیار کرلے۔ اگلی صدی میں یہ بھی ممکن ہے کہ اسلامی ریاستوں کا وفاق تشکیل پا جائے اور اکیسویں صدی میں متحدہ طور پر اپنے کردار کا تعین کرے۔اکیسویں صدی کے حوالے سے ہمیں یہ بھی مدنظر رکھنا ہوگا کہ دنیا بھر میں قومی ریاستیں بنانے کا رجحان (اسلامی ریاستوں میں بھی) ہے۔ دوسرے ممالک کی نسبت اسلامی ممالک کا اقتصادی اور فوجی لحاظ سے کمزور ہونا، ایک عالمی اسلامی خلافت کے احیا کا عدم امکان، وغیرہ کو نئے عالمی نظام کی تشکیل سے قبل ضرور زیر غور لانا

ہو گا۔

خلاصہ کلام

مذکورہ بالا چیلنجوں کا کس طرح مقابلہ کیا جائے؟ اس کے لیے ہم جو تصور پیش کر رہے ہیں اسے "ہجری نظریہ" کہہ سکتے ہیں کیونکہ آنحضرتؐ کی ہجرت مسلمانوں کے لیے غیر معمولی قدر و قیمت کی حامل ہے اور مسلمانوں کے لیے یہ ایک نئے دور کا آغاز ثابت ہوا تھا۔

الف۔ مسلمان ایسی سرگرمیوں میں ملوث نہ ہوں جو اسلامی افکار اور اسلامی کردار سے متصادم ہو۔ ب۔ ہجرت کے نقطہ کو آنحضرت کے مکہ سے مدینہ تک پہنچنے کے عمل سے محدود نہ کیا جائے۔ ہجرت سے مراد مسائل سے فرار یا اسلام کے بارے میں مدافعانہ رویہ اختیار کرنا نہیں ہے۔ ج۔ ہجری طرز عمل سے مراد بہتر زندگی کے حصول کی مسلسل کوشش ہے۔ د۔ مذہبی اور جغرافیائی اختلافات کے علی الرغم، تمام خیالات، معلومات اور مہارات کے بارے میں دیکھا جائے کہ اس کو جدید حالات میں ڈھالا جا سکتا ہے یا نہیں۔ ر۔ مسلمانوں کے درمیان زیادہ اتفاق، اتحاد اور یک جہتی کے حصول کے لیے چاہیے کہ وہ اپنے طرز عمل میں لچک پیدا کریں اور ان تفرقوں سے نجات حاصل کریں جو آج کے دور میں مسلمانوں کی شناخت بن چکے ہیں۔ س۔ دلیل پسندی، ترجیح پسندی، انصاف پسندی اور مبنی بر حق رائے بھی وہ نکات ہیں جن پر عمل پیرا رہنا ضروری ہے۔

(Hussin Mutalib : Islamic Resurgence and the Twenty- First Century: Redefining Old Agendas in a New Age. The American Jounnal of Islamic Social Sciences vol13 Number1 Spring 1996. P.88-99)

اس ماہ کے

○ اشارات: قومی بحران کا اصل حل از خرم مراد ۔/۷۵ روپے سیکڑہ
○ اختلاف امت: اسباب اور حل از مفتی محمد شفیعؒ ۔/۱۰۰ روپے سیکڑہ

اور پروفیسر خورشید احمد کا مقالہ سی ٹی بی ٹی پر دستخط اور پاکستان ۔/۱۲۵ سیکڑہ

تقسیم عام کے لیے دستیاب ہیں، طلب فرمائیے۔

منشورات منصورہ، لاہور ۵۴۵۷۰۔ فیکس ۰۴۲/۷۸۳۲۱۹۴